حکمتِ اقبال (۱۰)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی کی حقیقت

© rasailojaraid.com

خودی کے مزید اوصاف

خودی کوئی ایسی چیز نہیں جو مکان (SPACE) میں کہیں پڑی ہوئی ہو بلکہ اس کی اصل ایک فعلیّت ہے۔ وہ انسان کے فکر و عمل کی ایک قوّت ہے جو ایک مقصد اختیار کرتی ہے اور جس کا مقصد انسان کے افعال کو مربوط کرنا ہے اور ان کے اندر ایک وحدت پیدا کرنا ہے۔ یہ انسان کی وہی اندرونی قوّت ہے جو فیصلے کرتی ہے، اندازے قائم کرتی ہے، معلومات حاصل کرتی ہے، انسان کے رجحاناتِ فکر و عمل طے کرتی ہے اور اس کی آرزوں اور اُمیدوں کا اور اس کے عزائم اور مقاصد کا اور اس کے اندرونی احساسات و جذبات کا سرچشمہ ہے۔

اقبال لکھتے ہیں:

> جہاں اندرونی احساس موجود ہو وہاں خودی گویا اپنا کام کر رہی ہے۔ خود خودی کو ہم اُس وقت جانتے ہیں جب وہ کچھ معلوم کر رہی ہو، فیصلہ کر رہی ہو یا عزم کر رہی ہو۔ خودی یا روح کی زندگی ایک قسم کا تناؤ ہے جو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب خودی اپنے ماحول پر اثرانداز ہو رہی ہو اور ماحول خودی پر اثرانداز ہو رہا ہو۔ خودی باہمی اثراندازی کے اس میدان سے باہر کھڑی نہیں رہتی بلکہ اس کے اندر ایک حکمران قوت کی حیثیت سے موجود رہتی ہے اور اپنے تجربات کے ذریعہ سے اپنی تعمیر اور تربیت کرتی ہے اور اس موضوع پر قرآن کا

© rasailojaraid.com

ارشاد واضح ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل)

(یہ لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہیے روح خدا کے حکم کی پیداوار ہے اور تم لوگ کم ہی علم دیے گئے ہو)

لفظ امر کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن نے خلق اور امر کے درمیان جو فرق کیا ہے ہم اس کی طرف رجوع کریں۔ خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا اور امر کے معنی ہیں حکم دینا۔ چنانچہ قرآن میں ہے لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اسی کے لیے ہے پیدا کرنا بھی اور حکم کرنا بھی)

اوپر نقل کی ہوئی آیت کا مطلب یہ ہے کہ روح کی بنیادی فطرت حکم ہے کیونکہ وہ خدا کی حکمران قوت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم یہ نہیں جانتے کہ کس طرح سے خدا کا حکم ان وحدتوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک ایک خودی ہے۔ ضمیر متکلم جو لفظ ربّی میں ہے، خودی کی فطرت اور اس کے کردار پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ روح کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو منفرد اور معین ہو، ان تمام اختلافات کے سمیت جو اس کی وسعت میں اس کے توازن میں اور اس کی وحدت کی اثر اندازی میں پائے جاتے ہیں۔

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝

(ہر شخص اپنے طریق پر کام کرتا ہے اور تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون ہے جس کی راہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔)

اس طرح سے میری اصل شخصیت ایک چیز نہیں بلکہ ایک فعل قرار پاتی ہے۔ میرا تجربہ ایسے افعال کا ایک سلسلہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور جن کو ایک حکمران مقصد کی وحدت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہے۔ میری ساری حقیقت میرے حکمران جذبۂ فکر و عمل کے اندر موجود ہے۔ آپ میرا تصوّر اس طرح سے نہیں کر سکتے کہ گویا میری کوئی چیز ہے جو فاصلہ کے اندر کہیں پڑی ہے یا گویا میں مادّی دنیا کے موجود تجربات

© rasailojaraid.co

کا ایک سلسلہ ہوں بلکہ آپ کو چاہیے کہ آپ میری تشریح، تفہیم یا تعریف میرے اندازوں اور فیصلوں کی بنا پر، میرے رجحاناتِ فکر و عمل کی بنا پر، میرے عزائم اور مقاصد اور میری آرزوؤں اور امیدوں کی بنا پر کریں (ضمناً اس اقتباس سے یہ بات بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ جس چیز کے لیے قرآن نے روح کا لفظ استعمال کیا ہے اسی کو اقبال خودی کہتا ہے)

خودی مادّہ سے پیدا نہیں ہوئی

مغرب کے بعض حقیقت ناشناس حکماء نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کا شعور یا اس کی خودی فقط مادہ کی ایک ترقی یافتہ حالت کا وصف ہے۔ جب مادہ کے ذرّات ترقی کر کے حیوان کے دماغ کی صورت میں ایک خاص قسم کی طبیعاتی ترتیب اور کیمیائی ترکیب حاصل کر لیتا ہے تو اس میں شعور کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور جب یہ ترتیب اور ترکیب ختم ہو جاتی ہے تو یہ جوہر بھی ختم ہو جاتا ہے اقبال ایسے حکماءِ مادّیین سے یکسر اختلاف کرتا ہے۔ جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں وہ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہو سکتی ہے لہٰذا وہ ہمیشہ موت کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک وہ مر نہیں جاتے ممکن نہیں کہ وہ موت کے غم سے نجات پا سکیں، چنانچہ اقبال مادہ پرست حکیم کے پیرو سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

اقبال کے نزدیک خودی مادّہ کی کسی ترقی یافتہ حالت کا نام نہیں بلکہ مادہ کی ہر حالت کا وجود اس کا مرہونِ منّت ہے۔ وہ مادّہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس نے مادّہ کو پیدا کیا ہے۔ رُوح کی خاصیّت یہ ہے کہ وہ خدا کی محبّت کی شراب سے مست ہوتی ہے گویا روح مئے محبّت ہے اور انسانی جسم جو مادّہ یا خاک سے بنا ہے اس مے کا ساغر ہے۔ اقبال ان لوگوں سے جو مدّت سے جسم اور جان کے باہمی تعلق کے متعلق الجھن میں پڑے ہیں اور نہیں جانتے کہ آیا روح جسم (خاک تیرہ) سے ہے یا جسم روح سے، خطاب کر کے کہتا ہے کہ اصل مشکل یہ نہیں کہ مے ساغر سے ہے یا ساغر مے سے یعنی روح جسم سے ہے یا جسم روح سے، بلکہ یہ ہے کہ ساغر مے سے کیسے بھرا جائے یعنی محبّت کا کمال

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جوروح کی بالیدگی کے لیے ضروری ہے کیسے حاصل کیا جائے۔ تاہم یُوں سمجھ لینا چاہیے کہ جان کا تعلق بدن سے ایسا ہی ہے جیسا کہ معنی کا حرف سے۔ جان یا روح معنی ہے اور جسم حرف، جان تن کا جامہ اس طرح سے اوڑھ لیتی ہے جس طرح سے انگارہ اپنے ہی خاکستر سے قبا تیار کر کے اوڑھ لیتا ہے۔ معنی نے حرف اپنے اظہار کے لیے ایجاد کیا ہے اور انگارہ نے بھی اپنا قبائے خاکستر خود تیار کیا ہے جس طرح حرف معنی سے پیدا ہوتا ہے معنی حرف سے پیدا نہیں ہوتا اور خاکستر انگارہ سے بنتا ہے۔ انگارہ خاکستر سے نہیں بنتا اسی طرح سے انسانی جسم اپنی جبلّتوں یا حیوانی قسم کی خواہشوں کے سمیت خودی سے پیدا ہوتا ہے اور خودی جسم سے پیدا نہیں ہوتی:

عقل مدّت سے ہے اس پیچاک میں اُلجھی ہوئی
روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے
میری مشکل مستی و سوز و سرور و درد و داغ
تیری مشکل مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے
ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

خودی حقیقتِ کائنات ہے

یہ کہنا کہ انسانی خودی نے انسانی جسم اور انسانی جسم کی خواہشات کو خود پیدا کیا ہے اور وہ جسم سے پیدا نہیں ہوئی اس لیے درست ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت بھی ایک خودی ہے جس کو اقبال فلسفہ کی زبان میں کائناتی خودی کہتا ہے اور جس کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے۔ کائناتی خودی کے مقصد نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اس کا یہی مقصد شعور کی صورت میں اس کائنات کے اندر نمودار ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کائناتی خودی کا یہی مقصد ہے جو انسان کے جسم کو پیدا کر کے اس کے اندر انسانی خودی یا انا کی صورت میں آشکار ہوا ہے۔ ان معنوں میں یہ کہنا بجا ہے کہ انسان کی خودی نے ہی انسان کے جسم کو پیدا کیا ہے۔

قالب از ما ہست شد نے ما ازو　　ساغر از مے مست شد نے مے ازو

© rasailojaraid.co

اگر پوچھا جائے کہ ایک کرسی کی حقیقت کیا ہے تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ لکڑی لیکن لکڑی کی حقیقت کیا ہے؟ سائنس کا طالب علم بجا طور پر اس کا جواب دے گا "کاربن" لیکن کاربن کی حقیقت بھی کچھ اور ہے اور وہ ایک خاص قسم کے غیر مرئی مادی ذرات ہیں جن کو جواہر (Atoms) کہا جاتا ہے پھر ان سالمات کی حقیقت برقی توانائی ہے لیکن کیا برقی توانائی کائنات کی آخری حقیقت ہے؟ کیا اس کے پیچھے کوئی اور حقیقت ایسی نہیں جس کی پھر کوئی اور حقیقت نہ ہو اقبال اپنی انگریزی کتاب (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں ایک طویل بحث کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔

The Ultimate Nature of Reality is spiritual and must be considered as in Ego.

© rasailojaraid.com

(ترجمہ) کائنات کی آخری حقیقت کی فطرت رُوحانی ہے اور ضروری ہے کہ اسے ایک خودی یا ایغو تصور کیا جائے) اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت کے تمام مظاہر کا اور پُوری کائنات کے وجود کا باعث خودی ہے۔

یہ عالم یہ بُت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودیست
ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودیست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

© rasailojaraid.com

یُونانی حکماء کے قیاسات

جب سے حضرتِ انسان نے کائنات پر غور و فکر کا آغاز کیا ہے اس حقیقت کا ایک غیر متزلزل اور سکون پرور وجدانی احساس اس کا شریکِ کار رہا ہے کہ گویہ کائنات ایک بے حد وحساب کثرت کی صورت میں ہے تاہم یہ کثرت کسی ایک ہی چیز کے ایسے مختلف مظاہر پر مشتمل ہے جو بالآخر پھر اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس میں مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ہی چیز فی الواقع کون سی ہے، یہ مسئلہ ہمیشہ اس کی ذہنی کاوشوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ سب سے پہلے چھٹی صدی قبلِ مسیح میں یونانی فلسفیوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوششیں کیں۔ یونانی فلسفی تھیلز (THALES) کا خیال تھا کہ دنیا پانی سے بنی ہے اور تمام اشیاء پانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ انکسی مینز (ANAXEMENES) نے ہوا کو جس سے کہ تمام اشیاء کا ہیولیٰ قرار دیا۔ انکسی مینڈر (ANAXE MANDER) کا یہ خیال تھا کہ پانی، ہوا، آگ، مٹی ایسے عناصر دراصل کسی اور ہی چیز سے الگ ہو کر صورت پذیر ہوئے ہیں جو غیر محدود اور غیر متشکل ہے۔ دیما کرطیس (DEMOCRITUS) نے جسے موجودہ علمِ طبیعات کا بانی کہا جاتا ہے یہ نظریہ قائم کیا کہ دنیا کی آخری حقیقت جواہر (ATOMS) ہیں جو حجم اور صورت میں مختلف ہوتے ہیں تمام مرکب اجسام ان ہی سے بنتے ہیں اور مرکب اجسام کے اندر جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا باعث کچھ تو یہ ہے کہ جن جواہر سے وہ بنتے ہیں وہ حجم اور صورت میں مختلف ہوتے ہیں اور کچھ یہ کہ ان کے جواہر کی ترتیب الگ الگ ہوتی ہے۔

حقیقتِ کائنات کے متعلق قدیم حکمائے یونان کے ان نظریات میں یہ بات قدرِ مشترک ہے کہ اس حقیقت کی نوعیت مادّی ہے اس لحاظ سے یہ نظریات دورِ حاضر کے حکمائے مادّیین کے نظریات سے مختلف نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ مادّہ کے اوصاف و خواص کے متعلق آج کے حکمائے مادّیین کے تصورات زیادہ واضح ہیں تاہم ہمارے ان جدید حکماء کے نظریات اس بات کی تسلّی بخش وضاحت کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ مادّہ کے اندر زندگی اور شعور کے اوصاف کیونکر نمودار ہو گئے ہیں۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid

شعور اور مادّہ کا فرق

بظاہر شعور اور مادّہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، مادّہ بے حس اور بے جان ہے آپ ایک کرسی کو آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں دھکیل سکتے ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں، اگر چاہیں تو اس کے اجزاء کو الگ الگ کر سکتے ہیں اور پھر جوڑ سکتے ہیں، کرسی آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کرے گی۔ اس کا اپنا کوئی مقصد یا مدعا نہیں، تمام بے جان مادّی اشیا کی حالت ایسی ہی ہے لیکن شعور کی کیفیت مادّہ سے بالکل جُدا ہے۔ عام معنوں کے لحاظ سے جب مادّہ کے اندر شعور موجود ہو تو وہ ایک اندرونی مقصد یا مدّعا کے مطابق حرکت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اگر آپ ایک حیوان کی حرکات کو اپنی خواہش کے مطابق ضبط میں لانا چاہیں تو آپ کو ایک نہایت ہی پیچیدہ عمل کرنا پڑے گا جو اس بات کے گہرے مطالعہ پر موقوف ہو گا کہ ایک حیوان کا کردار خارجی اثرات سے کیونکر متاثر ہوتا ہے اور پھر بھی اس میں آپ کو پُوری کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔ اور وہ اس لیے کہ ہر حیوان کی حرکات اس کے اپنے اندرونی مقصد یا مدّعا کے مطابق سرزد ہوتی ہیں۔ اس بنا پر مدّعا کے مطابق عمل کرنا شعور کا ایک خاصّہ قرار دیا گیا ہے جو مادّہ میں قطعاً موجود نہیں۔

مادّہ اور شعور کی اصل ایک ہے

لیکن مادّہ اور شعور کے اس نہایت ہی وسیع ظاہری اختلاف کے باوجود فلسفیوں اور سائنسدانوں نے اپنے اس لاشعوری وجدانی اعتقاد کی وجہ سے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت ایک ہی ہونی چاہیے، ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ مادّہ اور شعور دونوں کو ایک ہی چیز ثابت کیا جائے۔ اس لیے یا تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں کہ شعور در اصل مادّہ ہی کی ایک ترقّی یافتہ صورت ہے اور یا یہ کہ مادّہ درحقیقت شعور ہی کی صفات کا ایک مظہر ہے۔ سائنسدانوں کا وہ طبقہ جو انیسویں صدی سے تعلّق رکھتا ہے، بالعموم اوّل الذکر نظریہ پیش کرتا رہا ہے اور اس کے برعکس فلسفیوں میں سے اکثر مؤخر الذکر نظریہ کے حامی رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے سائنسدان یہ سمجھتے تھے کہ مادّہ ایک غیر فانی حقیقت ہے اس لیے کسی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

چیز کی کوئی اصلیت نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے اوصاف وخواص مادّہ کی طرح نہ ہوں یعنی جب تک کہ اسے مادّہ کی طرح دیکھا اور چھوا نہ جاسکے یا وہ اس قابل نہ ہو کہ معمل میں اس پر مادّہ کی طرح تجربات کیے جاسکیں۔ چنانچہ یہ قدرتی بات تھی کہ وہ شعور کو ذی حیات مادّہ کی ایک خاصیت قرار دیں۔ یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ شعور کی مانند کوئی چیز تخلیق کائنات کا سبب ہوسکتی ہے یا مظاہر قدرت کے ساتھ اس کا کوئی سروکار یا علاقہ ہوسکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شعور مادّہ کی ہی ایک خاص حالت کا وصف ہے جو اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مادّہ ایک خاص کیمیائی ترکیب پالیتا ہے یا طبیعات کے خاص قوانین کے تحت میں آجاتا ہے۔

قدیم سائنسدانوں میں سے بائل (BOYLE) (۱۶۲۷-۱۶۹۱ء) نے کہا تھا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ "جب متحرک مادّہ کو اپنی جگہ پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس سے انسانوں اور حیوانوں کے مکمل اجسام ایسی حیرت انگیز موجودات یا اس سے بھی زیادہ محیّر العقول وہ اجزائے مادّہ جو زندہ حیوانات کے بیج کی حیثیت رکھتے ہیں، خود بخود وجود میں آجائیں"۔ چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ قدرت کے اندر ایک تعمیر کنندہ رُوح یا قوّتِ شعور کا ہونا ضروری قرار دیتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں صرف لارڈ کیلون (KALVIN) (۱۸۲۴-۱۹۰۷ء) ہی ایک ایسا سائنسدان ہے جس کی ذہانت نے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا کہ قدرت شعور کے اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوسکتی اور یہ کہ کائنات کے اندر ایک تخلیقی اور رہنما قوّت بھی کارفرما ہے۔ تاہم فلسفہ جو سائنس کی طرح حقیقت کی کسی جزوی یا محدود واقفیت پر کبھی قانع نہیں ہوا، اور جو تلاشِ حقائق میں وجدان کی راہ نمائی سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتا رہا ہے کہ عقدۂ کائنات کا معقول اور مکمل حل جس کے لیے انسان فطری طور پر بیتاب ہے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نظامِ عالم میں شعور کو ایک مرکزی حیثیت نہ دی جائے۔ قرونِ وسطیٰ کی اروپائی حکمت کا مقصد تو عیسائیت کی عقلی توجیہہ کے سوائے اور کچھ نہ تھا لیکن شعور جیسا کہ وہ انسان اور کائنات کے اندر موجود ہے، نہ صرف قرونِ وسطیٰ کے فلسفہ کا بلکہ عصرِ جدید کے ان بڑے بڑے فلسفیانہ نظریات کا بھی واحد موضوع رہا ہے جو ڈیکارٹ، لیبنز، سوپن ہار، نیٹشے، کانٹ، سپائینوزا، ہیگل، فشتے، کروچے اور برگسان ایسے متعدد فلسفیوں نے پیش کیے ہیں اور جن میں وہ خدا، روحِ کائنات، حقیقتِ مطلقہ، تصورِ مطلق، قوت، ارادۂ کائنات، شعورِ ابدی، افرادِ حیات، خود شعوری، قوتِ حیات وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(جاری ہے)

© rasailojaraid

بقیہ : درس سورۂ محمدؐ

گزاریاں' اور تقویٰ قربان ہو جائیں۔ یہ ساری چیزیں بھی اس کی کمی کے مقابلہ میں بے وزن اور ہیچ رہیں گی۔ نوعیت اور کیفیت کا عظیم فرق ہے۔ اس طرح صحابہ میں سے بھی کسی سے کسی معمولی کوتاہی کا صدور اگر ہوتا تھا تو اس پر اگر سرزنش کی جاتی تھی تو ان کے مقام اور مرتبے کی مناسبت سے گرفت کی جاتی تھی۔

یہاں نوٹ کیجئے کہ سورۃ الانفال میں جن چند افراد کا ذکر ہے کہ وہ قریش کا مقابلہ کرنے سے خائف تھے' ان کے متعلق تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں گیا۔ البتہ اگلے سال غزوۂ احد کے موقع پر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھ تین سو افراد کو لے کر راستہ ہی سے واپس ہو گیا...... یوں سمجھئے کہ ضعفِ ایمانی کا جو مرض تھا' وہ آگے بڑھ کر نفاق کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اس اعتبار سے عرض کر رہا ہوں کہ اگرچہ غزوۂ بدر کے موقع پر ایک بھی شخص واپس نہیں گیا لیکن یہاں اسلوب بیان ایسا ہے جیسے بڑی تشویش والا معاملہ ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ جو اس مرحلہ میں خوف زدہ تھے وہ اگلے مراحل کے لئے چوکس و چوکنے ہو جائیں اور آئندہ ان کی طرف سے ایسی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ اسلوب بیان اختیار کیا گیا کَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ○

اب اگلی آیت لیجئے فرمایا وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ "اور مسلمانو! یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہیں ضرور دے دے گا" ...... یہی بات مشاورت کے موقع پر حضورؐ نے فرمائی تھی۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ میری رائے ہے کہ یہ بات آپؐ نے اللہ کے ایماء پر اور اللہ کی وحی کے نتیجہ میں صحابہ کرامؓ کے سامنے رکھی تھی...... آگے فرمایا وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ...... "اور تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں وہ گروہ ملے جس میں کانٹا نہیں" ...... خیال یہ ہو گا کہ قافلہ کے ساتھ پچاس ساٹھ افراد ہیں' ان پر تو ایک ہی ہلّے میں قابو پا لیں گے' ہمارا کوئی بھی نقصان نہیں ہو گا' ہمارے کانٹا بھی نہیں چبھے گا اور بہت سامال

ہاتھ آجائے گا۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

لیکن اللہ کی منشاء اور اس کی مشیت کچھ اور تھی۔ اس کا ذکر آگے فرمایا وَ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ "لیکن اللہ چاہتا تھا کہ حق کا حق ہونا اپنے کلمات کے ذریعہ سے روشن کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے"۔ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَ یُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ "تاکہ سچا کر دے حق کو اور جھوٹا کر دے باطل کو اگرچہ یہ مجرموں اور گناہ گاروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"...... یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مدینہ سے نکال کر بدر کی طرف لے جایا گیا تھا۔ سورۃ الانفال کی ان آیات کے حوالہ سے اس پس منظر کو سمجھئے تو سورۂ محمدؐ کی زیرِ مطالعہ آیات سمجھ میں آئیں گی۔

سورۂ محمدؐ کی آیات کی جانب مراجعت

© rasailojaraid.c

اس تناظر میں سورۂ محمدؐ کی آیات کی طرف رجوع کیجئے فرمایا وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْکَ "اے نبی! ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپؐ کی بات بظاہر تو بڑی توجہ اور بڑے دھیان سے سنتے ہیں"۔ یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ اُن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جنہیں ضعفِ ایمانی کا مرض لاحق تھا۔ ان کو منافق نہیں کہا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی طبعی کمزوری اور کم ہمتی کی وجہ سے ابھی اُس طریقہ سے جان و مال کی بازی لگانے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے جس طور پر مہاجرین اب تک قربانیاں دے چکے تھے اور مزید کے لئے آمادہ تھے۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ بظاہر حضورؐ کی بات سنتے ہیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِکَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا "جب وہ اے نبیؐ! آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں تو اُن لوگوں سے پوچھتے ہیں جنہیں علم عطا کیا گیا ہے کہ ابھی ابھی حضورؐ نے کیا بات فرمائی تھی!"......

یہاں اُوْتُوا الْعِلْمَ سے میرے نزدیک وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم مراد ہیں جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہوئے دس دس، بارہ بارہ، پندرہ پندرہ برس گزر چکے تھے...... یہاں اشارہ ہے کہ غزوۂ بدر سے قبل اس مشاورت کے موقع پر یہ ضعفِ ایمان والے ان اصحاب علم سے پوچھتے تھے کہ ابھی آپؐ نے کیا فرمایا تھا!...... یعنی ان کی سمجھ میں بات نہیں آئی اس لئے نہیں کہ حضورؐ نے کوئی اجنبی زبان استعمال فرمائی

© rasailojaraid.c

تھی یا حضورؐ کی بات میں کوئی گنجلک تھی...... بلکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ جب انسان کی طبیعت میں آمادگی نہیں ہوتی تو سیدھی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی قتال کے لئے ذہن پوری طرح تیار نہیں ہوئے تھے کہ قتال کا حکم ہی نہیں بلکہ عملاً مقابلہ کی گھڑی بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ تو ان باطنی کیفیات کا نقشہ یہاں کھینچا گیا کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آئی' ...... حالانکہ مجلس میں مشاورت کے بعد فیصلہ ہوا تھا کہ ہمیں قافلہ کے بجائے لشکر کا رخ کرنا ہے۔ اصل میں اس طور پر بات کہنے میں اپنی بے یقینی کے کچھ جراثیم دوسروں میں داخل کرنے کا ارادہ بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ سرفروش اور جان نثار تھے جو اس بات کے منتظر تھے کہ موقع آئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں اور سرخرو ہو جائیں۔ دوسری طرف وہ چند لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ ہمیں اتنی عددی حمایت حاصل ہو جائے جس کی بنیاد پر حضورؐ کی خدمت میں درخواست کی جا سکے کہ فیصلہ پر نظر ثانی فرما لیجئے اور لشکر کی بجائے قافلہ کا رخ فرمائے۔ یہ تھی نفسیاتی کشمکش۔ اس تناظر کو اگر سمجھا نہیں جائے گا تو اس آیت کا یہ حصہ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّى إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا "ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بڑے دھیان سے اور کان لگا کر آپؐ کی بات سنتے ہیں لیکن جب آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں تو جو مسلمانوں میں صاحب علم ہیں اور جو اپنے فہم کے اعتبار سے نمایاں ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ "حضورؐ نے اس وقت کیا کہا ہے!"

اظہارِ ناراضگی

آگے فرمایا "أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ" اب دیکھئے کہ وہ کیسا اسلوب ہے۔ بڑا سخت انداز ہے۔ جو لوگ اللہ سے جتنے قریب ہوتے ہیں تو جب ان کی خطاؤں پر وہ عتاب فرماتا ہے تو الفاظ بہت سخت ہوتے ہیں...... ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم محمد کے ساتھی ہو صلی اللہ علیہ وسلم۔ تم اپنے مقام کو پہچانو۔ یہ تو وہ رتبہ ہے کہ جس کے لئے تا قیامِ قیامت لوگ حسرتیں دل میں پالیں گے کہ کاش ہمیں بھی حضورؐ کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی! اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنا عظیم فضل فرمایا ہے اور تمہارا حال یہ ہے! لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انداز ہے وہ بہت سخت ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر

© rasailojaraid.c

دی ہے" اور وَاتَّبَعُوْا اَهْوَاءَهُمْ "یہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں"۔ اور یہ لوگ جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ سازمیں

تمہارا حال تو یہ ہونا چاہئے کجا یہ کہ تمہیں موت بڑی ڈراؤنی لگ رہی ہے۔

مومنین صادقین کا رویہ

اب فوری تقابل دیکھئے آگے فرمایا وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ○ ان کے برعکس جو لوگ ہدایت پر آچکے تھے' جو ہدایت کی وادیاں اور مرحلے طے کر چکے تھے' جو آزمائشوں اور امتحانوں کی بھٹیوں سے گزر چکے تھے۔ ان سے حضورؐ نے مشاورت میں جو بات فرمائی' اس سے ان کی ہدایت اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوا..... ان کے یقین میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کے شوقِ جہاد اور تمنائے شہادت میں اور اضافہ ہوا۔ بالفاظ دیگر ان کے مرکب شوق کو مہمیز لگی اور وَاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرمایا۔ ان کے دلوں میں تقویٰ کی کیفیت' یقین کی کیفیت' ہدایت کی کیفیت مزید بڑھ گئی۔

میں پھر عرض کرتا ہوں کہ گنتی کے چند اصحاب ہوں گے جن کی طرف سے اس ضعف ایمانی کا مظاہرہ ہوا ہو گا لیکن قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ ذرا سی کمزوری کو بھی وہ نمایاں کر کے پیش کرتا ہے تاکہ ہر مسلمان یہ سمجھ لے کہ اس مرض کی آخری منزل کیا ہے! اگر آپ کسی کو بتائیں گے نہیں کہ بھائی تمہاری موجودہ حالت دراصل ٹی بی کی علامت ہے اور تمہیں سخت احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ تم اس کو معمولی مرض نہ سمجھو۔ بلکہ یہ بات جان لو کہ اگر تم نے بروقت اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں دی تو یہ بڑا مہلک مرض ہے' اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب تک یہ بات واضح طور پر بتائی نہ جائے گی' انسان کے اندر پرہیز کے لئے داعیہ پیدا نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اہل ایمان کی ذرا سی کمزوری پر سخت اسلوب اختیار کرتا ہے تاکہ ان کو انتباہ ہو جائے کہ اس ذرا سی کمزوری کے پیچھے "تل کی اوٹ میں پہاڑ" کے مصداق بڑی تباہی مضمر ہے۔ اگر اس کمزوری پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو

© rasailojaraid

اس کا نتیجہ وہ نکل سکتا ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ یہی بات سورۃ المنافقون میں بایں الفاظ فرمائی گئی ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ یہ لوگ ایمان لائے تھے لیکن اپنی منافقت کے باعث یہ لوگ اس کے بعد کفر کر چکے ہیں لہٰذا ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی ہے پس اب ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا......

کفّار کی طرف تحویلِ خطاب

اب اگلی آیت پر اپنی توجہ کو مرتکز کیجئے فرمایا فَھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ بَغْتَۃً "اب یہ لوگ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ اچانک ان پر آ جائے؟" یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف نہیں ہے بلکہ اب ان کفار کی طرف ہے جن سے مڈ بھیڑ ہونے والی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ دھمکے! "بغتۃ" کہتے ہیں۔ اس حادثے یا واقعے کو جو بغیر کسی تنبیہ (وارننگ) کے رونما ہو جائے۔

قیامت کی نشانی

آگے فرمایا فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُھَا "جہاں تک قیامت کی نشانیوں کا تعلق ہے تو وہ تو آ چکی ہیں۔" اس بات پر کہ اس وقت تک قیامت کی کون سی علامات آ چکی تھیں جن کا یہاں ذکر ہے، ہمارے مفسرین عظام نے کافی غور و خوض کیا ہے اور اپنی تحقیق کا حاصل بیان کیا ہے۔ جس رائے پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت کی ایک نشانی ہے۔ حضورؐ کی ایک حدیث بخاری میں، مسلم میں، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے جن میں حضرت انس، حضرت سہل بن سعد اور حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم شامل ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کھڑی کر کے فرمایا بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃَ کَھَاتَیْنِ "میری بعثت اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔" یعنی جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، کوئی اور انگلی نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان

© rasailojaraid

کوئی فصل نہیں ہے..... ظاہر بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بحیثیت خاتم النبیین و آخر المرسلین ہو گئی اور حضورؐ کے بعد کسی نوع کا کوئی نبی آنے والا نہیں ۔ تو گویا قیامت اب آیا ہی چاہتی ہے۔ ..... یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے حدیث میں آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا اٰخِرُ الْمُرْسَلِیْنَ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ "میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو" ..... لہٰذا اس کے بعد تو قیامت ہی آیا چاہتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں کوئی دن ایک ہزار برس کا ہے جیسے سورۃ السجدۃ میں فرمایا فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ اور کوئی دن پچاس ہزار برس کا ہے سورۃ المعارج میں فرمایا فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ تو ہمارے حساب سے قیامت بہت دور نظر آتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے حساب سے وہ سر پر کھڑی ہے اِنَّہُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰہُ قَرِیْبًا ○ تو یہ ہے وہ انداز کہ اب قیامت کی جو سب سے بڑی نشانی ہے وہ بعثت محمدی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام..... آیت کے اختتام پر فرمایا فَاَنّٰی لَہُمْ اِذَا جَآءَتْہُمْ ذِکْرٰہُمْ ○ "تو جب وہ قیامت خود ان پر آجائے گی تو پھر ان کے لئے نصیحت 'ذکریٰ' یہ قرآنی تذکیر کہاں مفید ہو گی!" ..... ظاہر بات ہے کہ یہ بات واقعاتی اعتبار سے مدینہ کے ضعفِ ایمان والوں پر چسپاں نہیں ہوتی۔ یہ انہی لوگوں پر چسپاں ہوتی ہے جن پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ برس تک فریضہ دعوت و تبلیغ بنفسِ نفیس سرانجام دیا ہے اور وہاں حضورؐ نے اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے شدید مصائب جھیل کر بھی احقاقِ حق اور بطال باطل کے فرض کا حق ادا کیا ہے۔ یہ ان کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی انہوں نے حق کو نہیں پہچانا تو اب ان کو کوئی نصیحت فائدہ نہیں دی سکتی 'اب کوئی یاد دہانی ان کے حق میں مفید نہیں ہو گی..... یہ بات سورۃ البقرہ کی آیات ۶ اور ۷ کے مشابہ ہے۔ وہاں فرمایا گیا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ اس کا مصداق کون لوگ ہیں! ظاہر بات ہے کہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر احقاق حق اور ابطال باطل آخری درجہ میں ہو چکا 'جن پر دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے اتمام ت ہو چکا۔ پھر بھی وہ لوگ ایمان نہیں لائے تو گویا ان کے دلوں پر مہر ہو چکی اور اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (جاری ہے)

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c